Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 2 (Oct-Dec 2023)
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

Causes of Intolerance in Society & its Solution in the Light of Seerah

عدم برداشت کے اسباب اور اُن کا حل سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

Dr Muhammad Iqbal Khan

Email : iqbalmtn@yahoo.com

PST (Govt. of Punjab Education Department Multan, Pakistan

Dr Muhammad Ashraf

Lecturer (F.G Girls Degree College Quetta Cantt

Email: ashrafbzu6@gmail.com

Ms. Mahrukh

MPhil Scholar Department of Islamic Studies Ghazi University Dera Ghazi Khan

Email: mahrukhdgk@gmail.com

Abstract

This article delves into the exploration of the Seerah, focusing on the inclination towards tolerance and the root causes of intolerance. Additionally, it proposes solutions to mitigate societal intolerance. The primary objective is to underscore the Seerah's principles and Islamic teachings that contribute to the development of a peaceful society within the framework of Islamic civilization. Within the discourse, the article contends that conflicts and disputes arising ostensibly in the name of religion are often driven by political motives

CC BY

rather than religious doctrinal differences. It emphasizes that a lack of tolerance not only poses challenges to individual lives but also disrupts the fabric of societal and communal existence. The article contends that intolerance breeds frustration, hopelessness, social disparity, and unfavorable domestic conditions, hindering the overall growth and development of a nation. Consequently, adopting appropriate attitudes, fostering optimistic behavior, and cultivating a conducive atmosphere are proposed as key strategies to address these issues.

Moreover, the article advocates for a transformation in educational institutions and systems, aligning them with the true essence of Islamic teachings, the Holy Quran, and the sciences of Hadith. It underscores the need to bridge the gap between theoretical and practical education. To achieve meaningful outcomes, economic policies must be reshaped to uplift the conditions of the impoverished, recognizing that an empty stomach hampers the expression of positive discourse and conduct. In summary, this article not only identifies the pressing challenges of oppression, cruelty, uncivilized attitudes, and societal disparity in the contemporary era but also offers solutions. It calls for a holistic approach that encompasses educational reform, attitudinal shifts, and socio-economic changes to pave the way for a more just and harmonious society.

Keywords: Intolerance, Patience, Disparity, Seerah, Etiquettes.

اُمت مسلمہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ وہ محسن انسانیت کی اُمتی ہے جن کی سیرت تمام سماجی، معاشی، علمی، اخلاقی علوم پر محیط ہے اس پر عمل پیرا ہو کر اگر کوئی قوم یا افراد زندگی بسر کرنا چاہیں معاشرتی طور طریقے، تہذیب، کلچر روایات کو لے کر چلنا چاہیں جس میں صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ قرعہ ارض پر سب کے لئے ہو تو سیرت سرور عالم کا لیٹر بیچر یہ رہنمائی اور سہولت عام کرتا ہے اس طرز عمل کو ہم اسلامی کلچر اور تہذیب کا نام بھی دے سکتے ہیں اسلامی معاشرے میں اس پر عمل پیرا ہونے کا مقصد ہی سماج میں محبت، اخوت اور برداشت کو فروغ دینا ہے جس سے ہر عام و خاص مستفید ہو سکتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے ظہور سے پہلے کی دنیا کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے۔ کہ کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو دنیا میں نہ پائی جاتی ہو۔ اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس میں اہل عرب مبتلا نہ ہوں۔ غرض سارا معاشرہ بگڑ چکا تھا۔ امت مسلمہ پر اللہ کی رحمت ہوئی اور اس نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کے لیے اپنے آخری پیغمبر محمد ﷺ کو معبوث فرمایا جنہوں نے بہت قلیل عرصے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی کے ہر شعبے کی رہنمائی فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جس تک آپ ﷺ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ معاشرے کی اصلاح کی خاطر رسول اللہ ﷺ کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑی لیکن تمام مصیبتیں سہنے کے باوجود آپ ﷺ نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کا کام جاری رکھا۔ اور عمر مبارک کے کسی لمحے میں بھی یہ مقصد آپ ﷺ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا۔ آخر کار 23 سال کی مختصر مدت میں وہ مثالی معاشرہ وجود میں آگیا جس کی نظیر دنیا آج تک پیش نہ کر سکی۔

1۔ اسلامی تہذیب و ثقافت اور تشدد کے رجحانات:

اب ہم ثقافت کا اسلامی تہذیب سے تعلق کو دیکھتے ہیں اس میں یہ بھی دیکھا جائے گا کہ معاشرہ میں مذہب کے نام پر مقتدر طبقہ نے عوام کے جذبات کو استعمال کیا یا نہیں اور کیا لڑی جانے والی جنگیں وہ اسلامی تہذہب کو قائم رکھنے یا سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے یا طول دینے کے لئے لڑی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مقتدر طبقہ نے عوام کے جذبات سے ہمیشہ مختلف کھیل کھیلے ہیں۔ اصل میں جھگڑا ثقافت کا ہے۔ جب کوئی خارجی قوت ہمارے ماحول میں مداخلت کر کے کوئی ایسا عمل شروع کرتی ہے جس سے ہمیں اپنی ثقافت کے غیر محفوظ ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو جائے، اس وقت ہم عقیدے کا سہارا لے کر مزاحمت کرتے ہیں اور مزید آگے بڑھ کر ظلم اور زیادتی کی حد میں چلے جاتے ہیں۔ ثقافت کا براہ راست تعلق سیاست سے ہے انسانی تاریخ کے آغاز سے مذہب کے نام پر جتنی جنگیں لڑی گئیں ہیں وہ دراصل سیاسی اقتدار کی جنگیں تھیں۔ عیسائیت کی ابتداء میں رومنوں کو چند لوگوں کے عقیدوں سے خوف نہیں تھا کیوں کہ تمام دوسرے مذاہب کی طرح ابتداء میں عیسائیت بھی غریب لوگوں کا مذہب تھا تاہم اگر عقیدے کی بنیاد پر غریب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو وہ ہر وقت کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں لہذا رومن حکمرانوں کو اصل خطرہ سلطنت کے حوالے سے درپیش تھا۔ چنانچہ عیسائیت کو دبایا گیا۔ اسی وجہ سے جو پہلی بغاوت ہوئی اسے غلاموں کی بغاوت کہا جاتا ہے۔ ان غلاموں نے عیسائیت قبول کر کے رومنوں کے خلاف بغاوت کی۔[1] یہ بغاوتیں ہر قسم کے معاشرہ میں ہوتی رہی ہیں چاہے معاشرہ

CC BY

کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اور بعض اوقات بغاوتوں کا تعلق ایک ہی قسم کے معاشرہ میں اسی معاشرہ کی مخالف جنس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ میں بھی مغربی معاشرہ کی طرح عورت کی آزادی کے نام پر عورت کی تقدیس کی بجائے تذلیل کی ہے اور اس کے باوجود قابل افسوس امر یہ ہے کہ خود عورت بھی اپنے آپ کو گھر میں رکھنے کی بجائے بازار میں آکر زیادہ خوشی محسوس کرتی ہے حالانکہ بازار میں آنے سے اس کے مختلف مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن شاید بے پردگی اور بازار میں خود شاپنگ کرنا بھی جدیدیت سمجھی جاتی ہے۔ ثقافت نے مادیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس ثقافت نے عورت کو ماں کے لقب سے پکارنے کی بجائے سیلز گرل، ماڈل، دوسرے لوگوں کے بچوں کی استانی سیکریٹری اور صفائی کرنے والی عورت کا لقب دینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ یہ ثقافت ہی تھی جس نے ماں کے مقام اور ذمہ داوری کو غلامی قرار دے کر اسے اس غلامی سے نجات دلانے کا وعدہ کیا۔ یہ ثقافت اس چیز پر فخر کرتی ہے کہ اس نے اتنی عورتوں کو خاندان اور بچوں سے آزاد کر کے "ملازم پیشہ" بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب نے ہمیشہ عورت کو ماں کے درجے میں عظیم الشان احترام بخشا ہے۔ اس نے اسے ایک علامت ایک راز اور ایک مقدس ہستی بنایا ہے۔ تہذیب نے ماں کی شان میں بہترین عقیدے اور اشعار لکھوائے ہیں اس تہذیب نے موسیقی تخلیق کرائی ہے۔[2]

مولانا معین الدین خٹک " اسلام اور عصر حاضر کا چیلنج" میں اسلامی ممالک پر غیر ملکی ثقافتی یلغار کے نقصان دہ امور سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ ان کا روک تھام کیا جاسکے اور غیر ملکی ثقافتوں سے مرعوب مقامی لوگوں کو اسلامی تہذیب و ثقافت کے دیرپا اصولوں سے آگاہی دینا لازمی بن جاتا ہے کیوں کہ غیر ملکی ثقافتوں کی ترجیح ہی ان کی اسلامی تہذیب سے ناآشنائی کو واضح کرتی ہے ۔ پھر ایک مسئلہ مسلمان ممالک میں ثقافت کے نام پر منفی قسم کی وہ کوششیں ہیں جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام سے مسلمانوں کی دلچسپی کو ختم کر دیا جائے اور ان کی اقدار کو ہی بدل دیا جائے تاکہ مذہب سے ان کا جذباتی لگاؤ ختم ہو جائے۔ پھر بھی اگر اسلامی نظام کا مطالبہ ہو یا اس کے قیام کا امکان پیدا ہو تو عوام کو اسلامی نظام کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا جاسکے کہ اس نظام کے قیام سے تمہاری " دلچسپیوں " کے سامان ختم ہو جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں میں بے حیائی اور فحاشی کے رجحانات کو پھیلانے کی کوشش جاری ہے۔ کئی عناصر، جن میں مغرب زدہ "ثقافت" پرست اور سوشلسٹ عناصر پیش پیش ہیں ۔ کئی برسوں سے بلکہ تقریباً ایک ربع صدی سے اس میں مصروف ہیں۔[3] یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر ملکی ڈگریاں تو بیرون ملک سے ملکی دولت مند حضرات اپنی اولاد کو نوازتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ وہ خرابی یہ بھی لاتے ہیں کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق رہن سہن اور ادب و آداب کی بجائے جدید تہذیب کو اپنا کر اپنی جدیدیت ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اسی جدیدیت نے علم کی بجائے نمبر حاصل کرنے کو اہم بنا دیا ہے اور اساتذہ کو بھی مربی کی بجائے معاشی سرگرمیوں کا حصہ ہی سمجھا ہے۔ سب سے بڑا سانحہ جو پیش آیا وہ یہ کہ " علم " کا رشتہ دینے والے سے ٹوٹ گیا، انسان نے علم کس سے لیا وہ اس کو بھول گیا، آج دنیا کا جو نقشہ ہے، مجھے سیاسی مبصرین معاف کریں، مجھے ملکوں کے منتظمین معاف کریں، مجھے سیاسی پارٹیوں کے رہنما معاف کریں، مجھے بڑی درسگاہوں سے تعلق رکھنے والے معاف کریں، یورپ اور امریکہ کے تمدن کو دیکھ کر جن کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اس تمدن پر فخر کرنے والے معاف فرمائیں کہ سب سے بڑی غلطی جس کو عربی میں کہوں تو" ام الامراض " اور اپنی زبان میں کہوں تو غلطیوں کو جنم دینے والی غلطی کہوں گا۔ وہ انسان کی یہ بھول ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس جگہ کا اصل اور مالک سمجھ بیٹھا ہے، ایک مرتبہ وہ بھولا کہ وہ کہاں سے

CC BY

آیا ہے تو پچاس مرتبہ وہ بھولا کہ اسے کہاں جانا ہے۔[4] مولانا عبد القدوس ہاشمی اپنی تصنیف " مقالات ہاشمی " میں مسلمانوں کے قرآن و سنت کے علوم سے رشتہ منقطع کرنے یا کم کرنے کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ان بنیادی علوم سے رشتہ کی کمزوری کا فائدہ ایسے لوگ اٹھا رہے ہیں جو ہمارے معاشرہ میں نفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں لہذا نفاق کو اتفاق سے بدلنے کے لئے دوبارہ رشتہ بنیادی علوم سے استوار کرنا ہو گا۔ فی زمانہ ان علوم سے بہت کم لوگوں کا تعلق رہ گیا ہے۔ صرف علماء ان کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس لئے حضرت مولانا نے عام مسلمانوں کے استفادہ کے لئے یہ مقالہ ترتیب دیا ہے اور اس سے علم حدیث پر نہایت جامع بحث کر کے تقریباً سوا سو ایسی موضوع احادیث دے دی ہیں جو بے حد مشہور ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ان کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہے یا دوسرے لوگ ان موضوعات کی مدد سے ان کو دھوکا دیتے اور گمراہ کرتے ہیں۔[5] محمد تقی عثمانی علوم جدیدہ کی تدریس کے لئے اسلامی تعلیمات کے ماہر اساتذہ کی تعیناتی کو ضروری سمجھتے ہیں جو کہ علوم جدید سے آراستہ ہوں اور اپنے طلباء کے ذہنوں میں علوم جدیدہ کے اسلام دشمن خیالات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان سے بچاؤ کا حل بھی بتا سکیں۔ علوم جدیدہ فی نفسہا دین اور علوم دینیہ کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے مرتبین بڑے بڑے غیر مسلم ہیں اور انہوں نے ان علوم کو اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ لازماً طلباء کے دلوں میں دین اور اس کے اجماعی رویوں کے خلاف شکوک و شبہات کے بیج بو دیئے جاتے ہیں اور اس شکل کا واحد حل یہی ہے کہ یا تو ان علوم کی کتابوں کو از سر نو مرتب کیا جائے یا پھر ایسے ماہرین ان کو پڑھائیں جن کو اسلام اور اس کے علوم میں مہارت تامہ اور مکمل معرفت حاصل ہو۔ نیز دشمن کی مکاریوں اور ملحدین اور غیروں کی کتب میں فساد کی بنیادوں سے بھی مکمل طور پر واقف ہوں اور ان دونوں امور کا حل مدارس دینیہ کے لئے انتہائی مشکل کام ہے۔[6]

2۔ مسلمانوں کی فکری تہذیب:

زمانہ قدیم سے ہی ہر تہذیب میں خیر و شر کی رسوم پائی جاتی ہے اور اسی طرح خیر و شر کی قوتیں بھی اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق عمل جاری رکھتی ہیں لیکن مسلمانوں کی فکری تاریخ میں رد و قبول کا عمل یہ خیر کو قبول اور شر کو رد کرتا ہے۔ مسلمانوں کی فکری اور سماجی تاریخ میں مختلف نظاموں کو آزمایا گیا یہ اسی حرکی تصور (Dynamic Concept) کے طفیل ممکن تھا۔ ان سے جو عناصر اخذ کئے گئے نظام تک میں جذب کر لئے گئے۔ یہ وہ عناصر تھے جن سے بنیادی مقاصد کی نفی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اجزا رد ہوتے رہے، جو انسانی ارتقاء سے خارج یا اس سے براہ راست متصادم ہوئے۔ رد و قبول کا یہ عمل مسلسل ارتقاء پذیر معاشرے کا حصہ ہے۔ اس لئے تجزیے، مشاہدے اور عقیدے کی سان پر مختلف نظاموں کو پرکھا جاتا رہا ہے۔ خیر و شر کی آویزش میں انسانی فکر کی نمو پذیری کے لئے اس طرح کا تصادم ضروری بھی تھا۔[7] ڈاکٹر فضل الرحمن مسلمانوں کی فکری تاریخ کے حوالے سے خوارج کی مذہب پسندی اور پر تشدد رویہ کے بارے میں درج ذیل انداز سے رقم طراز ہیں کہ تعصب، کٹر پن اور الگ تھلگ رہنے کی ہی خصوصیت ہے جو خوارج کی حکمت عملی رہی اور پھر اسے ترقی دے کر تقریباً عقائدی حیثیت دے دی گئی، نیز ان کی یہ پالیسی کہ سیاسی تبدیلی تشدد کے جان جوکھوں میں ڈالنے والے طریقوں سے لائی جائے، ان سب نے خوارج کے اس سب سے پہلے اسلامی

CC BY

فرقے کو امتیاز عطا کیا ہے۔ فرقے کے نام خارجی میں کفر کے کوئی عقائدی مضمرات نہیں ہیں بلکہ اس کے سادہ معنی باغی کے ہیں یا ایک انقلابی سرگرم عمل۔ ایک خارجی شاعر پہلے کے ایک خارجی قائد ابو بلال مرداس (681ء) کی موت پر ایک مشہور مرثیے میں کہتا ہے۔" ابو بلال کی موت نے زندگی کو ناقابل برداشت بنادیا ہے اور خروج کو میرے لئے مرغوب بنادیا ہے" ویسے حقیقت یہ ہے کہ اپنے کٹر پن اور بے جگری سے لڑنے کے طریقوں سے قطع نظر خوراج بے حد پارسا اور شدت کے ساتھ مذہبی انسان تھے۔ ان کی یہ دونوں صفات دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے ایک ابتدائی خارجی رہنما ابو حمزہ کے اس خطبے کے درج ذیل اقتباس میں وضاحت سے سامنے آتی ہے، جو اس نے 129ھ میں بنو امیہ سے مدینے کا قبضہ حاصل کرنے پر دیا تھا۔[8]

3۔ ہمارا منقسم مذہبی معاشرہ:

انور غازی کے مطابق بنیاد پرستانہ رویوں کے ساتھ ساتھ فرقہ ورانہ خیالات اور مسلکی اختلافات بھی معاشرے کے امن و سکون کے خلاف ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں عرصہ طویل کی حکمت عملیوں کی بجائے عرصہ قلیل کے مطابق وقتی طور پر حل تلاش کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے پائیدار حل مسائل کے لئے قابل غور ہی نہیں سمجھا گیا۔ بریلوی دیو بندی اختلافات کوئی آج کی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہے لیکن اب اچانک اس معاملے میں تشدد، قتل وغارت، جلاؤ گھیراؤ کا جو عنصر داخل ہوا ہے، یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے جس کی غیر جانب دارانہ تحقیق از حد ضروری ہے۔ یاد رہے اب بھی اگر" مٹی پاؤ اور ڈنگ ٹپاؤ" قسم کی حکمت عملی اپنائی گئی اور اس واقعہ کی غیر جانب دارنہ تحقیقات نہ ہوئیں تو خاکم بدہن یہ کوئی آخری حادثہ نہیں ہو گا۔ بار بار یہ مطالبہ کیا کہ ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا جائے لیکن انتظامیہ مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہی ہے۔ اس طرح قرآن حکیم کی بے حرمتی کرنے والوں، لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں کو اگر عبرتناک سزا نہ دی گئی تو ان کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے اور ملک کے کسی بھی حصے میں اس قسم کے مزید واقعات رونما ہو سکتے ہیں لیکن عوام کے شعور اور علماء کی حکمت و دانش اور اہل مدارس کے صبر نے اس سازش کو آپ ہی مردہ کر دیا۔[9] ہمارے ملک میں مسلکی اختلافات کے ساتھ ساتھ صوبوں کی بنیاد پر بھی اختلافات پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نہ تو ہم مذہبی پلیٹ فارم پر متحد ہو سکے ہیں اور نہ ہی ہم سیاسی پلیٹ فارم پر متحد ہو سکے ہیں اور آئے دن کے یہ اختلافات اتحاد کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ ہیں۔ ہمارے ہاں دو قسم کے نفاق پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک قومی نفاق ہے۔ پہلے ہم ہندوؤں کے مقابلے میں ایک قوم تھے۔ ہم نے اپنی تحریک کے لئے" دو قومی نظریہ" کو بنیاد بنایا۔ آج ہم نفاق باہمی کا شکار ہو کر قومیتوں میں تحلیل ہو گئے۔ اب الگ الگ قومیں ہیں۔ چار تو شروع سے تھیں، پنجابی، پٹھان، بلوچی، سندھی، اب اس میں سرائیکی اور مہاجر قومیت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ بھی مدعی ہیں کہ ہماری علیحدہ قومیت ہے۔ الغرض یہ نفاق باہمی کے مظاہر ہیں۔[10]

ابو عمار زاہد الراشدی کے مطابق ہمارا ملک پاکستان اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر قائم ہونے کے باوجود پچیس سالوں کے بعد محض ایک دستور کی چند اسلامی دفعات کو ہی تشکیل دے سکا جن پر عمل درآمد ابھی تک مکمل طور پر نہ کیا جا سکا جس کی وجہ سے پاکستان مسائلستان بنتا جا رہا ہے۔ پاکستان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ بنا اسلام کے نام پہ، پر پہلے دن سے وہاں اسلامی نظام

CC BY

حکومت کے لئے اس انداز کی جدوجہد چل رہی ہے جیسے حکمرانوں کے لئے یہ نظام ایک ناقابل قبول چیز ہو۔ ابتدائی دنوں کی سخت جدوجہد کے بعد اتنی کامیابی اس سلسلہ میں ملی کہ دستور ساز اسمبلی نے "قرار داد مقاصد" نام کی ایک قرار داد پاس کرادی۔ یہ گویا ملک کے لئے اسلامی دستور کا سنگ بنیاد ہوا۔ مگر دستور بننے میں وہ لوہے لگے کہ کہیں 1973ء میں جاکے یہ ہو سکا، یعنی پاکستان کے قیام پر ایک چوتھائی صدی گزرنے کے بعد۔ یہ دستور بہر حال ایسا بن گیا کہ جو طبقہ اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد کر رہا تھا اس نے بھی ضرورت کی حد تک اسے قابل قبول مان لیا۔ لیکن جتنی بھی حکومتیں اس دستور کے ماتحت بنیں ان میں سے کسی کا بھی طرز حکومت اس طبقہ کے لئے اطمینان بخش نہیں رہا۔[11] جہاں تک اسلامی نظام کے نافذ العمل ہونے کا تعلق ہے ملک پاکستان کے مقتدر طبقہ اور علماء کے خیالات کی غیر ہم آہنگی بھی اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلم طاقتیں جن کے مفاد پاکستان کی غیر اسلامی حکومت سے وابستہ ہیں وہ بھی اسلامی نظام کی تنفیذ کا خواب پورا نہیں ہونے دیتی ہیں ۔ موجودہ پاکستان میں جدت پسندوں اور علماء کے مابین اس مسئلہ پر غور کرنے کے انداز میں جو بنیادی فرق ہے اس نے، قانون، ملک کے دستور اور اداروں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے، جدت پسندوں کے لئے خود کو ماضی سے توڑنا اور موجودہ دنیا کو اس کی اپنی شرائط اور اقدار کے مطابق قبول کر لینا سخت دشوار ہو گیا ہے۔ دوسری جانب علماء اور خاص کر مولانا مودودی کے اساسیت پسند مکتب کے لئے بھی حال سے بالکل قطع تعلق کر کے ماضی میں پناہ لینا دشوار ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظریہ تفسیر کے تعلق سے کہ جو ثقافتی قطع وبرید کے لئے ضروری و مطلوب ہے اور مختلف انداز ہائے فکر کے درمیان ایسی سعی مفاہمت جو ان کو ایک رخ پر لے آئے، ایک الجھاؤ اور انتشار پیدا ہو گیا۔[12] علماء اور مقتدر طبقہ کے اختلافات کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کے بعض اہل علم بھی پاکستان کے علماء کو دین اسلام کے نفاذ میں مخلص نہیں سمجھتے کیونکہ علماء کے مسلکی اختلافات بھی علماء کو متحد نہیں ہونے دیتے۔ اس کے ساتھ بعض مسالک کی سرپرستی بیرونی طاقتیں بھی کرتی ہیں جس کی وجہ سے اختلافات بڑھتے جارہے ہیں۔ مسلم دنیا کے کئی دانشور بھی دینی مدارس کے راہنماؤں پر پھبتیاں کستے ہیں اور علماء پر ایک سنگین الزام یہ عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت کے علماء کرام کا موقف اصولی تھا۔ وہ کہتے تھے آپ کو کشور حسین میں بیٹھ کر عیش کریں گے جو کروڑوں مظلوم مسلمانوں ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا والی وارث کون ہو گا؟ وہ تا قیامت بے بسی کی دلدل میں اترتے چلے جائیں گے۔ ان کی زندگی میں کبھی بھی صبح امید نہیں آئے گی ان کے علمائے کرام کو یہ اندیشہ تھا کہ تحریک پاکستان میں شامل ہو جانے والے ہزاروں کھوٹے سکے ناقابل اعتبار ہیں۔ ان ملکوں سے خیر کی کوئی امید نہیں۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد انہوں نے کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ملک میں سازشیں اور چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔[13] مولانا سمیع الحق جدید مسلم نسل کے دین بیزار جذبات کی نشاندہی کرتے ہوئے غیر ملکی ثقافتی یلغار اور غیر اخلاقی مواد کی تشہیر واشاعت کی روک تھام کو ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ جس کی وجہ سے طلباء کے ذہنی سطح پر دین مخالف خیالات سے آبیاری اسی دین مخالف اشاعتی مواد سے کی جاتی ہے پشاور یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کفر وارتداد کا یہ مسلم آزاد لٹریچر نہ صرف لائبریریوں بلکہ کلاسوں اور مختلف ہاسٹلوں تک پہنچ کر خالی الذہن اور سادہ لوح طالب علموں کے ذہنی انتشار، فکری بے چینی اور دین وعقیدے کے تذبذب کا باعث بن رہا ہے۔ اس ملک کے باشندے جو عمل و کردار کی ساری خامیوں کے باوجود ذاتِ رسالت مآب خاتم النبیّن ﷺ سے والہانہ عشق رکھتے ہیں اور

CC BY

جن کا ایمان ہے کہ دامن مصطفیٰؐ کا چھوٹ جانا ضیاع دین و ایمان اور سراسر ہلاکت و خسران ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس دانائے سبل، ختم الرسلؐ کے سایہ رحمت کے سوا کوئی دوسرا ایسا سہارا نہیں مل سکتا جو انہیں ابدی مسرتوں اور کامیابیوں سے ہم کنار کرنے کی ضمانت دے۔ اگر اس رحمت للعالمینؐ کی ذات کو بیچ سے ہٹا دیا جائے تو یہ دنیا تو سراسر شیطنیت سر تا پا ظلم اور سراپا اندھیرا رہ جائے گی۔[14] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ درست مواد اور غیر درست مواد کے متعلق نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مفید اور درست مواد کی پہچان یہ ہے کہ جو قرآنی تعلیمات اور رسول اکرمؐ کے اقوال کی نفی نہ کرتا ہو اور جو نفی کرتا ہو گا وہ لامحالہ مفید نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نظام تعلیم میں بھی ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاحاصل قیاسات پر مبنی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اس چیز کو مانیں جو خدا اور رسولؐ کے دیئے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔[15] معاشرہ میں پھیلتی ہوئی فرقہ پرستی کی روک تھام کا ایک حل یہ بھی ہے کہ غیر جانبدارانہ انداز میں تعلیمی نصاب کی اشاعت کی جائے تاکہ ہر مسلک کے لوگ اس کا مطالعہ کریں اور کسی مسلک و فرقہ کی حوصلہ افزائی و حوصلہ شکنی بھی نہ ہو۔ اس طرح کے اقدام مشکل تو ضرور ہوں گے لیکن ناممکن نہیں ہیں۔ اس طرح معاشرہ میں اتحاد کی فضا قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ ایسے مختلف المذاہب اور مختلف العقائد ملک کے لئے سب سے زیادہ دانش مندانہ طرز عمل یہ ہے کہ اس ملک میں عمومی و جبری نظام تعلیم کو پوری شدت اور خلوص و دیانت داری کے ساتھ غیر جانب دارانہ اور نامذہبی رکھا جائے اور اس کو آبادی کے کسی عنصر اور کسی فرقہ کے (خواہ وہ تعداد میں کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو) عقائد و مذہبی روایات کا نمائندہ اور وکیل نہ بنایا جائے، ایسا ممکن ہے، اور اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے۔ خود یورپ و امریکہ میں جہاں مذہبی احساس ہندوستان کی طرح تیز بھی نہیں ہے اس کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں نصاب کی کتابیں بالکل غیر جانب دارانہ اور غیر مذہبی ہوتی تھیں۔ اور ان میں کسی فرقہ یا قوم کی مخصوص چھاپ اور اس کے مذہب کی جھلک نہیں ہوتی تھی، یہ طرز عمل ہندوستان کے لئے ہر زمانہ میں مناسب ہے۔[16] ڈاکٹر اسرار پاکستانی معاشرہ کی اخلاقی حالت اور ایمانی حالت کی نشاندہی ، قابل ذکر الفاظ میں نہیں کرتے کیوں کہ چند روپے کی خاطر جھوٹی قسمیں اٹھانا اور جھوٹ بھی معمول بن چکا ہے اخلاقی حالات کی گراوٹ یقیناً مسلم معاشرہ میں ایمانی سطح کی گراوٹ کی علامت ہے۔ اخلاقی سطح پر قوم کا دیوالیہ نکلا ہوا ہے اور اخلاقیات کی اسلامی اور ایمانی سطح تو درکنار عام انسانی سطح پر بھی اخلاق کے بحران (Moral Crises) سے دوچار ہیں، دراصل ہم بحیثیت قوم اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی سزا اور پاداش کے طور پر نفاق عملی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔[17] جہاں تک معاشرے کی اصلاح کا تعلق ہے اس بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مسلمان امت کی خوبی ہی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بتائی ہے جب کہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ اب نیکی کا حکم تو کسی حد تک دیا جارہا ہے لیکن برے کام کرنے والوں کو اور ظلم و زیادتی کرنے والوں کو روکنے کا عمل سرانجام نہیں دیا جارہا جس کی وجہ سے برے کام روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ معاشرتی اصلاح کلی ہو یا جزوی بہر حال اس کا بنیادی اصول مزاحمت ہوتا ہے۔ اگر اصلاح کے مطلوب معاشرے کے ساتھ پر امن بقائے باہمی اختیار کر لی جائے تو اصلاح کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا اور مزاحمت کا مطلب برا بھلا کہنا، ترک تعلق کر لینا یا لڑائی جھگڑے میں مشغول ہو جانا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی امور میں سرگرم شرکت کے ساتھ ساتھ اصلاح طلب انداز و اطوار نہ تو خود اختیار کئے جائیں اور نہ ان کو قبول کیا جائے بلکہ دوسروں کو ان کی مضرت (حقیقی مضرت) کا قائل کرنے کی جدوجہد جاری رکھی

CC BY

جائے اور اپنے طرز فکر و عمل پر استقامت اختیار کی جائے۔ اللہ اسی ایمان کو کو قبول کرتا ہے جس کے ساتھ کفر بالطاغوت بھی موجود ہو۔ " پس جو طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں" (256:2) اور مزاحمت کفر بالطاغوت کی عملی صورت ہوتی ہے اس انداز مزاحمت کی بہترین مثال نبی اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔[18] معاشرتی اصلاح کے عمل میں معاشرے کے تمام طبقات اپنی اپنی حیثیت سے کردار ادا کر سکتے ہیں البتہ علمائے کرام اور اساتذہ کرام بالخصوص اپنے آپ کو قول و فعل میں یکسانیت کے اظہار سے اصلاح کے عمل میں دیر پا اثر پیدا کر سکتے ہیں جب وہ خود بھی محنت کے عادی ہوں اور اصلاح کا عمل بھی جاری رہے۔ اگر ہمارے اساتذہ ایسی بے چین روح اور ایسا بے تاب جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اتنی غیر محدود صلاحیت کے مالک ہیں، ان کا رشتہ تعلیم سے براہ راست ہے، تعلیم نے ان کے کانوں میں اپنا راز کیا ہے، اور خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہے اور اپنے کو اس کا نمائندہ سمجھتے ہیں تو وہ کامیاب معلم ہیں، ہزار آندھیاں چلیں، الحاد کے طوفان اٹھیں، کیسے کیسے زلزلے آئیں، لیکن ان کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے۔[19] ڈاکٹر فضل الرحمن " اسلام اور جدیدیت" میں معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لئے ٹیکنالوجی کو اختیار کرنے کی بجائے ذہن سازی پر زور دیتے ہیں اور غربت و فاقہ کشی کی حالت کو بدلنے معاشی اعمال اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ مسلم معاشروں میں تخلیق تعلیم کی جو کمی اب تک رہی ہے اس کی میں نے دو وجوہات بیان کی ہیں، ایک غلامانہ اور بے تکے طریقے سے نو آبادیاتی دور کے تعلیمی نظاموں کو جاری رکھے چلے جانا، جیسا کہ ترکی میں ہوا۔ مغربی نمونے کی غلامانہ نقالی کرنا۔ دوسرے وہ جادو جو مادی ترقی کے نظریے نے منصوبہ بندوں پر کیا، اس کی وجہ سے یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل رہی کہ جب تک انسان کا ذہن تبدیل نہ ہو اور جب تک وہ نئے جذبے سے سرشار نہ ہو، ٹیکنالوجی انسانی معاشرے کو بہتر بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلم معاشروں میں یہ چیز جبھی پیدا کی جاسکتی ہے جب اس نئے جذبے کو کسی بلند مقصد اور کسی واضح اور متعین منزل کے ساتھ نہ جوڑ دیا جائے۔ اگر یہ پہلے کر لیا جاتا تو اسلام ترقی کے لئے ایک انتہائی طاقتور عامل ثابت ہو سکتا تھا، اس لئے کہ مصیبت دور کرنا اور غربت اور دکھ میں کمی کرنا ایسی باتیں ہیں جن کا قرآن اور پیغمبر کی سنت میں جگہ جگہ ذکر آتا ہے۔[20]

پس خوشی کے ساتھ غمی اور غمی کے ساتھ خوشی کا آنا ایک فطری اَمر ہے اور انفرادی مسائل کے ساتھ ساتھ ادارتی مسائل کی موجودگی بھی فطری اَمر ہے۔ فرق صرف مسائل کے کم ہونے یا زیادہ ہونے میں ہو سکتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں سرکاری اداروں کے سب کمپس اور پرائیوٹ اداروں کے قیام اور ڈگریوں کے اجراء نے طلباء کو بعض ایسے مسائل سے دوچار کر دیا ہے کہ بعض ادارے U.G.C. یونیورسٹی گرانٹس کمیشن جو کہ موجودہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن ہے اس کے تحت رجسٹرڈ ہیں جب کہ ان کے سب کیمپس نان رجسٹرڈ ہیں جو کہ مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ روز افزوں بین الاقوامی رابطوں خاص طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اور جدید دنیا میں طلبہ اور علماء و فضلاء کی آمد و رفت، اداروں کی حیثیت کا تعین، استاد کا معادلہ اور تعلیمی کورسوں کو تسلیم کرنا اب ایک پیچیدہ مسئلہ بن چکا ہے جس کا تعلیم کے ارباب اختیار کو سامنا ہے۔ ڈگری عطا کرنے والے سرکاری اور نجی شعبے کے اداروں کی تعداد، ان کے تدریسی مضامین کے تنوع اور وہاں پڑھائے جانے والے مضامین میں اضافہ کے سبب معاملات مزید الجھ گئے ہیں۔ پھر بھی جو معیار اور طریق کار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن / کمیشن برائے اعلیٰ تعلیم نے

CC BY

وضع کیا ہے وہ جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس سے جن مسائل میں یہ معاملات الجھے ہوئے ہوں ان کا مناسب حل مل جاتا ہے۔[21] " خطبات راشدی" میں ابو عمار زاہد الراشدی دینی مدارس کو درپیش مسائل اور دینی مدارس کے خلاف بین الاقوامی منظم پراپیگنڈہ کی نشاندہی کرتے ہوئے دینی مدارس سے منسلک طلباء اساتذہ اور علماء اور صاحب اقتدار طبقہ کو بھی حقیقت حال واضح کرنے کے لئے جدید دور کے ذرائع سے لیس کرنے پر زور دیتے ہیں۔ بہر حال دینی مدارس کو ایک چیلنج عالمی سطح پر یہ بھی درپیش ہے کہ انہیں عالمی میڈیا اور لابنگ کے ادارے یورپ کے قرون مظلمہ کے پس منظر میں ظلم اور جہالت کے نمائندے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح دینی مدارس کو اپنے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے امیج کو صحیح کرنے اور اپنی تصویر کو عالمی سطح پر بہتر بنانے کے چیلنج کا بھی سامنا ہے۔[22] معاشرتی اصلاح کے عمل میں بہتری لانے کے لئے اور اپنے ملک کے طلباء کو اسلامی شعار سے منسلک کرنے کے لئے ہمیں اسلامی تہذیب و تمدن کو خوبیوں سے لبریز مسلم مصنفین کی کتب کو نصاب میں نافذ العمل کرنا ہو گا تا کہ طلباء تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھی تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ شروع شروع میں ایک کارکن کو بتایا جاتا ہے کہ تعلیمی محاذ ہمارے سپرد ہے اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، جب ایک رکن دیکھتا ہے کہ اس سرحد پر نقب لگائی جارہی ہے اور تنظیم اس کو روکنے کی کوشش تو درکنار اس احساس سے بے خبر ہے مثال کے طور پر ہم اپنے اداروں میں دوسروں کی کتب لگانے پر مجبور ہیں کیوں کہ ہم نے اس میدان میں اب تک کوئی کام نہیں کیا ہے نظام امتحانات کی ہم اصلاح نہیں کر پائے متبادل نظام سے ہم بے خبر ہیں اگر ہمارے پاس ایسا کوئی نقل پروف نظام ہے تو اسے کم از کم اپنے اداروں میں بھی نافذ نہیں کر پائے ہیں۔ یہ صورت حالات ارکان میں عدم فعالیت پیدا کر رہی ہے۔[23]

4۔ عدم برداشت کا کلچر اور سیرت رسول ﷺ:

بیرون کلچر کی یلغار اور مغربی طرز عمل کی کشش کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی فرقہ واریت اور علاقائی تعصب بھی پاکستان کی نئی نوجوان نسل کے لئے پریشان کن حالات میں جن کا سامنا انہیں کرنا پڑتا ہے اور آپس کی فرقہ واریت کو دیکھ کر بعض نوجوان دین کو مورد الزام کم علمی کی وجہ سے سمجھتے لگتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ جن میں سنی، شیعہ، اہل حدیث، بریلوی اور دیوبندی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سارے فرقے پنجاب میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان سب نے اپنی تبلیغی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی اور قادیانی مذاہب کے پیروکار بھی زیادہ تر پنجاب میں رہتے ہیں۔[24] جہاں تک صبر و تحمل کا تعلق ہے اصل میں یہ اقدار تو نبوی اقدار ہیں جو کہ ہر دور میں ہر نبی کی تعلیمات اور تبلیغ کو کوششوں میں دیکھی جا سکتی ہیں لیکن پاکستان میں خصوصاً روز بروز چھوٹی چھوٹی باتوں پر تحمل و بردباری کی بجائے لڑائی جھگڑے اور تشدد ایک عام معمول بنتا جارہا ہے جو کہ اسلامی معاشرے کے افراد کے لئے انفرادی و اجتماعی سطح پر قابل فکر خیال کیا جائے گا کیونکہ دین اسلام کی تعلیمات تو بردباری کا سبق دیتی ہیں جبکہ تشدد تو اسلامی تعلیمات کے منافی عمل ہے۔ آج کل معاشرے میں مختلف قسم کے انتہا پسندانہ رویے جنم لے رہے ہیں ان رویوں کا تعلق انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اجتماعی انتہا پسندانہ رویے معاشرے کو شکست وریخت کا شکار بنا دیتے ہیں اور ایسے لاینحل مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جن کے دیرپا منفی اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔[25] ڈاکٹر محمد طارق ایوبی مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی کے قومی سطح پر پُر تشدد رویے اور سازشوں کے بارے

میں خیالات کو اپنی تصنیف میں درج ذیل انداز بیان کرتے ہیں کہ سازش تو سازش ہوتی ہے، ہماری ملی تاریخ ان سے پر ہے۔ مولانا نے ذہنی انتشار، کردار کشی کی مہم اور شریعت اسلامی کے بارے میں بے اعتمادی اور پریشان خیالی کی تفصیل سے وضاحت کی ہے، فقہی جزئیات کو عوامی بحث اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہونے والے خطرات و نقصانات کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک طرف مسلم پرسنل لاء کا کام اور اس کی کامیابی کا تذکرہ کیا ہے اور پھر جو لکھا ہے وہ انجام سے ناواقفیت، بے محل گفتگو، خطرات سے آگاہ نہ ہونے یا پھر کسی سازش کا ہی حصہ ہو سکتا ہے۔[26]

حافظ محمد نعیم الدین بھی جدید دور میں نوجوان مسلمانوں کا غیر مسلموں کے پر کشش ہتھکنڈوں میں پھنسنے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو مغربی تہذیب و تمدن سے کم تر سمجھنے کا عمل انتہائی خطرناک ہے جو انہیں لازماً اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اسلامی تعلیمات سے دور کرتا ہے۔ آج مسلمانان عالم کی نوجوان نسل بے خبری اور یہود و ہنود کے پھیلائے ہوئے جال میں بے بس احساس کمتری میں مبتلا کئے جا رہے ہیں کہ اسلام ایک فرسودہ اور پسماندہ نظام حیات ہیں جکڑا ہوا ہے اور یورپ و امریکہ اپنی علمیت و آگہی میں بے مثال ہیں۔ ایسے ناگفتہ و نازک وقت میں یہ مدارس دینیہ کا ہی علمی سلیقہ اور دانائی و حکمت کا کرشمہ ہے کہ تحقیقی و اصلاحی میدانوں میں قرطاس زیست پر اپنے خون سے آگہی اور علم کے موتی بکھرے اور سنبھالا دیا اور تاریخ اسلام میں بکھرے ہوئے اسلاف کے کارنامون کو بیان کر کے بے خبری کی فضا میں آگہی اور فخر کا سامان فراہم کیا کہ اسلام کی ابتدائی صدیاں اپنی تہذیب، ثقافت اور علوم کے لحاظ سے شاندار اور ناقابل فراموش حیثیت رکھتی ہیں۔[27] اسلامی تعلیمات سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کو دور کرنے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک بھی اسلامی تعلیمات کی بجائے مغربی تہذیبوں اور مغربی طرز عمل کو زیادہ قابل عمل ثابت کرنے میں بعض مغرب پرست اساتذہ کا ہاتھ ہے جو اپنے خیالات طلباء کو منتقل کرتے ہیں۔ ہماری درسگاہوں میں آج ایسے استاد موجود ہیں جو دن رات طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ شب و روز ان کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کی کوئی تہذیب نہیں ہے، اسلام کا کوئی تمدن نہیں ہے اور اسلام کے کوئی سیاسی اصول نہیں ہیں۔ اسلام کے معاشی اصول اگر کچھ ہیں بھی تو وہ اس زمانے میں نہیں چل سکتے[28] کسی بھی معاشرہ میں ہر قسم کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ایک قابل عمل اور دوسرے نہ تو خود عمل کرتے ہیں اور نہ ہی طلباء کو عمل کی تاکید کرتے ہیں۔ اسی طرح علمائے خیر عوام کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں جب کہ علمائے شر عوام کے لئے نعمت و رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا ان سے بچاؤ کے لئے فرق کرنا لازمی ہے۔ علماء سوء کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ عوام کو صحیح کام کرنے والوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور عوام جتنے زیادہ ان پڑھ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ ان کے دام میں آجاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر سلیم الفطرت واقع ہوا ہے۔ ماں کے پیٹ سے بری فطرت لے کر نہیں آیا۔ ہمارے عوام الحمدللہ مسلمان ہیں۔ وہ نیک و بد میں تمیز کرنا جانتے ہیں۔ آج بھی ان دیہاتی لوگوں میں کام کے لئے وہ خود بخود یہ فیصلہ کر لیں گے کہ حق بات کون کہتا ہے اور ناحق بات کون کہتا ہے۔[29] پر تشدد رویے اور عدم برداشت کے پس منظر میں ہمارے ملک کے پائے جانے والے مختلف تعلیمی ادارے اور ان اداروں کے مختلف نصاب کا بھی کسی نہ کسی حد تک کردار ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کے تعلیمی ادارے کے طلباء دوسرے قسم کے حاملین طلباء کے بارے میں اچھی اور مناسب رائے نہیں رکھتے جس کی وجہ سے ہر قسم کے نصاب کے تعلیم یافتہ دوسروں

CC BY

کے متعلق ہم آہنگی نہیں رکھتے۔ یہ چیز بھی معاشرے میں عدم برداشت کو پروان چڑھا رہی ہے۔ تعلیمی حلقے اور مدارس سخت جمود و تقلید کا شکار اور ایک علمی و فکری انحطاط میں گرفتار نظر آتے ہیں، متقدمین کی علم آموز اور ذوق آفرین کتابیں نصاب تعلیم سے رفتہ رفتہ خارج کر دی گئیں، ان کی جگہ پر ان متاخرین کی کتابیں آ گئیں جو اپنے فن میں درجہء اجتہاد نہیں رکھتے تھے اور متقدمین کے صرف مقلد یا شارح تھے، متون کی جگہ شروح و حواشی نے لے لی جن کی تالیف میں ان کے مصنفین نے کاغذ کے بارہ میں سخت کفایت شعاری سے کام لیا تھا اور عام فہم اور واضح زبان کے بجائے اشارات و رموز میں لکھا تھا اس سب سے اس ذہنی و علمی انحطاط اور پستی کا اندازہ ہو گا جو پورے عالم اسلام پر طاری تھی اور جس سے اس کا کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں تھا۔[30] حافظ محمد نعیم الدین کے مطابق دینی مدارس ہی ایسے ادارے ہیں جو طلباء کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی آراستہ کرتے ہیں اور وہ طلبا کو دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور انہیں ان سازشوں سے بچاؤ کے لئے پر امن طرز عمل اختیار کرتے ہوئے تیار کرتے ہیں۔ مدارس نے علوم قدیمہ و جدیدہ کا ایسا فیض ان کے رگ و پے میں اتارا کہ ایک طرف سے بے داغ شباب لئے تیغ خودی بے نیام کئے۔ طاغوتی نمائندوں کے منصوبے جات پر ضرب کاری لگاتے ہوئے زشید ان غاب اور برق مرگ آور سے بڑھ کر ثابت ہونے لگے اور دوسری طرف امن و امان کے متلاشیوں کے لئے رعنا غزال تاتاری اور پریشم ثابت ہونے لگے۔ پھر تاریخ کے کئی گوشے اس سراپا فیض علم کو دیکھ کر پکار اُٹھے۔[31]

مولانا عزیز احمد کے مطابق قدیم اور جدید علوم سے آراستہ حضرات جدید مغربی تعلیم یافتہ افراد سے مختلف نقطہ نظر رکھتے ہیں کیوں کہ دونوں علوم کے حاملین عملی طور پر جدید اور قدیم کے امتیازات کو بھی سمجھتے ہیں اور اسلامی معاشرہ کے لئے حقیقی انداز میں مفید اور نقصان دہ چیزوں کا بھی ادراک رکھتے ہوئے علمی و عملی دونوں طرح راہنمائی کر سکتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں اور جنہوں نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ دیوبند اور علی گڑھ کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جو 1912ء میں مولانا محمود الحسن کے پیش نظر تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے قومیت (نیشنلزم) کی جو مخصوص مختلف تعریف کی ہے وہ مغربی سیاسی سائنس کی اصطلاح سے بالکل جدا ہے۔ مؤخر الذکر کو وہ قومی عصبیت کے مترادف ہونے پر زور دیتے ہیں اور اس کا مقصد دوسری اقوام کو حقیر سمجھنا اور ان کے استحصال کرنا ہے جو اسلام کے منافی ہے۔ وہ اسے قومی خصوصیات یا عوام کے رواجی قانون سے تعبیر کرتے ہیں جو اسے دوسروں سے یا ان کے مزاج سے مستمیز کرتا ہے۔[32] ہماری بد قسمتی ہے کہ جو ملک اسلامی نظریہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور جس کے مقصد ہی اسلامی نظام کا نفاذ تھا لیکن سات عشروں کے بعد بھی ہم اپنے ملک کے کسی بھی نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق عملی طور پر نافذ نہ کر سکے جس کی وجہ سے ہمارے مسائل میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے ان احکام پر تو عمل درآمد ہو رہا ہے جن کا تعلق مسجد سے ہے۔ بعض لوگ اسلام کے احکامات پر اپنے گھروں میں بھی عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا تعلیمی، عدالتی نظام اور ہماری فوج اور پولیس کے نظام ہائے کار مکمل طور پر اسلام کے قوانین کے مطابق نہیں ہیں۔ ہمارا معاشی اور اقتصادی نظام سود کی لعنت میں گرفتار ہے۔ ہماری تجارت، ہماری معیشت اور ہمارے دیگر شعبہ ہائے حیات غیر اسلامی قوانین کی متابعت میں استوار کئے گئے ہیں۔[33] جہاں تک ہمارے معاشرے میں بنیاد پرستانہ رویوں کا تعلق ہے یہ سراسر ایسے لوگوں کی وجہ سے پروان چڑھ رہا ہے جن کے مطابق قدیم روایات اور قدیم مذہبی خیالات ہی قابل عمل ہیں اور ان کے خیالات اجتہاد و قیاس پر

CC BY

عمل ضروری نہیں ہے اور اجتہاد انہ رائے سے گریز کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ بنیاد پرستی مذہب کے نام پر قوموں کے انتظامی اقتدار، معاشی وسائل اور سماجی اختیار پر قبضے کی سیاسی تحریک ہے جس کا مفروضہ مقصد جدید سیاسی ڈھانچوں، اجتماعی اداروں، سماجی رویوں اور فکری رجحانات کو رد کر کے معاشرے میں رہنما اصول کے طور پر مذہبی احکامات کی لفظی تشریح اور قدیم مذہبی قیادت کی مطلق ، مکمل اور تنقید سے ماورا بالادستی تسلیم کرنا چاہتا ہے اس سیاسی خواہش کا اظہار چیدہ چیدہ مذہبی عقائد اور اس سے اخذ کردہ روزمرہ اخلاقیات سے متعلق احکامات کی اجتماعی توثیق اور قانونی نفاذ کے مطالبے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔[34] اندرونی اختلافات کے ساتھ ساتھ بیرونی سازشوں نے بھی مسلمانوں کو متحد ہونے سے دور کر رکھا ہے لیکن دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے پہلے اپنے آپ کو درست کرنا ہو گا اور باہمی اتحاد و اخوت کی فضا کو اجاگر کرنا ہو گا کیوں کہ بیرونی مداخلتیں اور سازشیں اندرونی نفاق کی صورت میں کارگر ہو سکتی ہیں۔ مغربی پالیسی ساز مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے جواز کے لئے یہ مؤقف اختیار کرتے ہیں کہ اسلام بجائے خود تشدد اور دہشت گردی کا علم بردار ہے اور قرآن بزور قوت اپنے نظریئے کو پوری دنیا پر تسلط کرنے کی مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے۔ تو اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ اگرچند مسلم ملکوں میں مغربی استعمار کے آلہ کار حکمران اس سلسلے میں بھی مغربی پالیسی سازوں کے احکام بجالانے میں سرگرم ہیں ان کی ہدایت کے مطابق قرآن کی آیات جہاد کو نصابی کتابوں سے نکلوایا جارہا ہے اور اسلام میں اعتدال کی ضرورت کا اظہار کر کے یہ تاثر دیا جارہا ہے گویا اسلام انتہا پسندی سکھاتا ہے اور قرآن جبر و تشدد کا مبلغ ہے مگر حقیقتاً قرآن سراسر عدل اور رحمت کا پیغام ہے۔[35] ہمارے ملک میں مسلکی اختلافات اور علاقائی تعصبات کے ساتھ ساتھ ملکی قوانین بھی سب کے لئے یکساں نہیں ہیں علمی طور پر حاکم طبقہ اور محکوم طبقہ میں ہر سطح پر فرق رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ غریب کی گواہی اور غریب کو غربت ولاچاری کی وجہ سے مشکوک سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ باہمی اختلافات و نفرتوں کا بڑھنا لازمی ہوتا ہے۔ موجودہ دور کے وضعی قوانین صرف محکوم کے واسطے بنائے جاتے ہیں۔ حاکم ان سے عملاً بالا رہتا ہے۔ حاکم کا طرز عمل کسی قاعدہ قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ مذہب کے خاتمہ کے بعد اب وہ مشترک بنیاد معدوم ہو گئی جس سے دادرسی کی جاتی۔ اب مظلوم کے پاس چارہ جوئی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مذہب کے خاتمہ کے بعد سے چند افراد کی مطلق العنانی میں اضافہ ہو گیا اور سارے معاشرہ کے مظالم میں بھی اضافہ ہو گیا۔[36] پروفیسر ملک محمد حسین ''ماہنامہ البرہان'' میں بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کرنے والے سیاست دانوں اور بیوروکریسی کے افسران کے غلط کاموں کو بھی دہشت گردی سے منسوب کرتے ہیں کیوں کہ ان کے کاموں کی وجہ سے بھی معاشرے کے غریب طبقے پر دہشت طاری رہتی ہے۔ یہ بھی دہشت گردی ہے کہ کوئی اپنے ظالمانہ اختیارات کو استعمال کر کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کے معاشی حقوق کا قتل عام کرے اور انہیں بھوکا ننگا کر دے۔ یہ بھی دہشت گردی ہے کہ دفتروں میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بڑے بابو، لوگوں کے جائز کاموں میں رکاوٹیں ڈال کر انہیں ایک طرف ذہنی مریض بنائیں اور دوسری طرف ان کی جیبوں پر ڈاکے ڈالیں۔ اور یہ بھی دہشت گردی ہے کہ مقتدر سیاست دان اپنے اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی وسائل کو بے دریغ طریقے سے لوٹیں اور ملک و قوم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کریں۔[37] سماجی طور پر ایسے رویے اور اختیارات کے ناجائز استعمال سے عوام میں عدم برداشت کا کلچر پروان چڑھتا ہے۔

5۔ سیاسی جماعتوں کے علماء کا کردار:

CC BY

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ سیاسی وکاروباری قیادت کی نسلیں اب تعلیم وتربیت کے لئے بیرون ملک کے تعلیمی وتربیتی اداروں اور جامعات سے حصول علم کو ترجیح دیتی ہیں اسی وجہ سے ان میں مغربی کلچر سے لگاؤ اور مغربی تہذیب وثقافت کی جاذبیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس وجہ سے بیرونی اداروں کی ڈگریوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے رہن سہن اور مغربی طرز عمل بھی وہ ہمارے معاشرے میں واپسی پر اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ نظریاتی سطح پر قوم کے ذہین عناصر اور تعلیم یافتہ طبقات میں مغربی افکار و نظریات سے پیدا شدہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ انداز فکر اور جدید تہذیب وثقافت کا پروردہ اباحیت پسندانہ نقطہ نظر تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ اب اس کی منطقی انتہا یعنی ماکسزم اور کیمونزم نے بھی ہماری نوجوان نسل کے ایک خاصے بڑے حلقے میں قدم جمالئے ہیں۔[38] خالد رحمن کے مطابق ماضی کی نسبت موجودہ دور میں مسلکی اختلافات میں قدرے کمی واقع ہو رہی ہے اس کی وجہ سے بین المذاہب ہم آہنگی اور بین المسالک ورکشاپس اور کانفرنس ز (کانفرنسز) ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا رواداری کی تعلیمات سے طلباء کو آگاہی دینا بھی ہو سکتا ہے۔ مدرسہ مسلک کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے یوں مسلک کے حوالے سے تعلیم اور مسلکی شناخت پر زور بہت سے تنازعات اور تصادم کا سبب بھی بنتا رہا ہے اور اب بھی فقہی مباحث میں اپنے روایتی مسلک کے بر خلاف موقف کی مثالیں کم کم ہی ہیں۔ تاہم مطالعہ میں شامل ان بڑی جامعات کے ذمہ داران کے انٹرویوز سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ مذہبی و مسلکی رواداری میں اضافہ ہو رہا ہے۔[39]

جہاں تک دینی جماعتوں کے سیاسی کردار کا تعلق ہے اکثر دینی جماعتوں میں تربیتی نظام تقریباً ناپید ہے جس کی وجہ سے سیاسی میدان میں ان کی ناکامی یقینی ہے کیوں کہ سیاست کے میدان میں کامیابی کے لئے دینی جماعتوں کا اپنا مضبوط نیٹ ورک ہونا ضروری ہے تاکہ سیاسی میدان میں ووٹ بینک بھی ہو اور سیاست کی سوجھ بوجھ بھی ہو۔ ہمارے خیال میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفاذ اسلام کے لئے ان کا ہوم ورک نہیں ہے۔ ان کے بیشتر کارکنوں بلکہ رہنماؤں کو بھی نفاذ اسلام کے فکری اور عملی تقاضوں کا ادراک نہیں ہے اور نہ ہی ان نظریاتی اور واقعاتی رکاوٹوں سے آگاہی ہے جو نفاذ اسلام کی راہ روکے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے سوا کسی اور جماعت کے پاس رہنماؤں اور کارکنوں کی فکری علمی اور عملی تربیت کا سرے سے کوئی نظام ہی موجود نہیں ہے اور جماعت اسلامی کے تربیتی نظام کی بنیادیں بھی اجتماعی فکر کے بجائے شخصی فکر پر ہے جس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو رہے اور نہ ہی وہ شخصی فکر دینی حلقوں کا اعتماد حاصل کر سکا ہے۔[40]

اسی طرح معروف محقق انور غازی کے مطابق بعض بیرونی ممالک کی خواہش کے مطابق مدارس کے طلباء کو خواہ مخواہ نہ صرف پریشان کیا جاتا ہے بلکہ انہی کی زبان میں مدارس کے غریب ویتیم بچوں پر منفی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام لگانا بھی ایک معمول بن چکا ہے علاوہ ازیں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو بنیاد پرست جب کہ مغربی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ماڈرن سمجھا جاتا ہے جو کہ درست عمل نہیں ہے۔ مدارس پر سب سے بڑا الزام دہشت گردی کا لگایا جارہا ہے۔ بلاجواز چھاپے مار کر مدارس کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی قرآن وسنت پڑھنے والے غیر ملکی طلبہ کو گرفتار کر کے ان کا تعلق القاعدہ سے جوڑنے کی کوشش کی گئی لیکن حکومت کی ساری مشینریاں بھی اس بات کو ثابت نہ کر سکیں کہ ہزاروں مدارس میں کسی ایک کا تعلق بھی القاعدہ سے ہے۔ امریکہ وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے دورہء پاکستان کے موقع پر اسلام آباد سمیت کراچی کے دینی مدرسے کے

CC BY

تقریباً150 طلباء کو گرفتار کیا گیا جن میں 3 تاجک طلبہ بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ گرفتاریاں دراصل ہیلری کلنٹن کو سلامی تھی ورنہ ان تمام طلبہ میں سے کسی ایک کا تعلق بھی القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا۔[41]

6۔ مغربی تہذیب کے اثرات:

"احیائے اسلام اور معلم" کے مصنف خرم جاہ مراد مشرقی تہذیبوں پر مغربی تہذیب کے اثرات کو درج ذیل انداز سے بیان کرتے لکھتے ہیں کہ جب مغربی تہذیب نے مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کیا تو بات یہ نہ تھی کہ ہم تعلیم سے بے بہرہ تھے یا یہ کہ ہم جاہل تھے، ان پڑھ تھے۔ لیکن اس نے آکر سب سے پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ ہمارے اس وسیع نظام تعلیم کو غیر موثر اور کمزور کر کے بالآخر بے جان کر دیا۔ جو ہر مسلمان ملک میں گاؤں گاؤں دیہات دیہات پھیلا ہوا تھا اور جس کے ذریعہ مسلمانوں میں یہ تعلیم عام تھی اور تقریباً ہر مسلمان پڑھا لکھا تھا۔[42] محمد تقی عثمانی اپنی تصنیف " اسلامی اور جدت پسندی " میں مغرب کے مخلوط نظام تعلیم اور ہمارے مغرب زدہ ذہنوں کی نقالی کے رجحان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی ہر چیز کو ترقی کی علامت نہیں سمجھنی چاہئے بلکہ ترقی یافتہ قوموں کی چیزیں اخذ کرنے سے پہلے ان کے فوائد و نقصانات اور اسلامی معاشرہ سے ہم آہنگی کو بھی دیکھنا چاہئے آپ کو معلوم ہے کہ مغرب میں مخلوط طریقہ تعلیم رائج ہے۔ آپ نے اسے بھی تہذیب کی علامت سمجھ کر اس کی تبلیغ شروع کر دی، لیکن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارانہ فرمائی کہ کسنے رپورٹس (Kisney Reports) نے امریکی معاشرے کی جو تصویر کھینچ کر دنیا کے سامنے رکھی ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟ نہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا کہ ہمارے نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور مسلسل گرتے ہوئے معیار تعلیم کی ذمہ داری کن کن چیزوں پر عائد ہوتی ہے۔[43] مفتی تقی عثمانی " اصلاح معاشرہ " میں بھی مغرب کی اندھی تقلید کی بجائے اسلامی معاشرہ کے لئے اس کے فوائد و نقصانات کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں تا کہ پھر ہمارے لئے واضح ہو گا کہ مغرب کی یہ چیز ہمارے لئے نافذ العمل ہونی چاہئے یا گریز ہی بہتر ہے۔ لیکن ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر مسئلے میں مغرب کی اندھی تقلید کے اس بری طرح عادی ہو چکے ہیں کہ " اصلاح " کے کام کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہو گیا ہے کہ اپنے معاشرے کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی سرکاری سطح پر "اصلاح" کے نام سے جتنی کوششیں ہوئی ہیں وہ ان حلقوں کے سپرد کی گئیں جن کی سوچ کا دائرہ مغرب اور اس کے افکار سے آگے نہیں بڑھتا۔ انہوں نے اپنے معاشرے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے قرآن و سنت کے بجائے مغرب کو بنیاد بنایا اور اپنے مسائل پر معاشرہ مغرب کا ہو بہو چربہ بن جائے "۔[44]" اسلامی ریاست کی تشکیل جدید" میں معروف نو مسلم سکالر محمد اسد کے مغرب والوں کے متعلق خیالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے محمد ارشد لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیت کی مخالفت کوئی آج کے دور کی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ماضی کی کئی صدیاں پہلے سے ہے۔ اسد کی رائے میں اسلام سے مغربیوں کی نفرت و بدگمانی اور رقابت و دشمنی جو مذہب کی راہ سے وجود میں آئی اور صلیبی جنگوں کے دوران خوب پروان چڑھی، مابعد دور میں بدستور زندہ و توانا رہی۔ اسی نے اندلس میں مسلمانوں کے خلاف وہاں کی مسیحی رعایا کو برسرپیکار کیا اور مسلمانوں سے جنگ و قتال کے لئے ان کو نئے ولولے سے سرشار کیا۔ چنانچہ اندلس سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کے لئے بڑی سفاکی اور بہیمیت کا مظاہرہ

CC BY

کیا گیا۔ اندلس میں مسلم سلطنت کی تباہی پر تو یورپ خوشی و مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔[45] پروفیسر نثار احمد فاروقی پاکستان کے نظام تعلیم کی خرابی مغربی اداروں کی پالیسیوں اور عمل دخل کو قرار دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں نظریاتی تعلیم اور عملی تعلیم میں نمایاں فرق بڑھتا جارہا ہے حتیٰ کہ طلباء میں علم حاصل کرنے کے شوق کی بجائے محض نمبر حاصل کرنے کی دوڑ شروع ہے۔ جب سے مغربی نظام تعلیم نے مشرق پر شب خون مارا ہے، مدارس کا مقصد صرف تبلیغ دین اور تحفظ شریعت ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ بھی بلند اور لائق احترام مقصد ہے، مگر دنیوی تعلیم کو اپنے ہاتھوں سے مغربی اداروں کو سونپ دینا بھی کچھ دین کی خدمت نہ ہوئی۔[46] " اسلام اور عصر حاضر " میں مولانا سمیع الحق بھی پروفیسر نثار احمد فاروقی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مغرب کی پیدا کردہ خرابیوں کے حل کے لئے مغربی سکالرز کی حمایت اور تعاون حاصل کرنے کی کوششیں، مرض کو بڑھانے کے مترادف ہیں۔ یورپ کے ہاتھوں پوری انسانیت بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہوئی، پریشانی انتشار اور بے یقینی کی اس بحرانی کیفیت نے رفتہ رفتہ پورے عالم اسلام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، مغرب کی خدا بیزار تہذیب اور مادیت پر کھڑا کیا گیا، تمدن طاعون کی طرح ہر سو پھیلنے لگا اور آج بد قسمتی سے مملکت عزیز پاکستان بھی پوری شدت سے اس کی زد میں ہے۔ طبقاتی، علاقائی، لسانی اور نظریاتی جنگ ایک عفریت کی طرح اسے ہڑپ کرنا چاہتی ہے اور تاریخ کی بے مثال قربانی سے حاصل کی گئی مملکت پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے، مریض جان بلب ہے مگر مرض کی تشخیص کون کرے اور علاج کب موثر ہو جب کہ مرض کا علاج مرض ہی سے کیا جارہا ہے اور اسی عطار سے نسخہ ءشفاء مانگا جارہا جس نے زہر کھلا کھلا کر مریض کو لب گور تک پہنچا دیا ہے۔[47]

" ہمارا نظام تعلیم " کے مصنف محمد تقی عثمانی جدید دور کے علماء کو جدید دور کی بین الاقوامی زبان انگریزی سے آگاہی ضروری قرار دیتے ہیں تاکہ مستشرقین کے انگریزی زبان میں اسلامی مخالف مواد کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو اور نئی نسل کے لئے ایسے مواد کی نشاندہی اور روک تھام بھی ہو سکے۔ مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر " تحقیق " کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا ایک انبار تیار کر دیا ہے جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے یہ لٹریچر جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے جو آج کے ذہن کو اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں۔ اس زہر کا تریاق فراہم کرنا علماء کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے انگریزی زبان اور ان عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے جن کو اس کاروائی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔[48] ثروت جمال اصمعی تو اپنی تصنیف میں اہل مغرب کے علماء و دانشوروں کے طریقہ واردات کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ جہاد کی آیات مبارکہ کو اس کے پس منظر کے بغیر پیش کر کے غیر مسلموں اور نو مسلموں اور نئی نسل کے مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ اسلام کو تشدد اور دہشت گردی کا علم بردار قرار دینے کی مغرب میں جاری جارحانہ مہم کا عمومی طریق واردات یہ ہے کہ جہاد و قتال وغیرہ سے متعلق قرآنی آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کی بنیاد پر اسلام کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ مغربی جرائد میں اور ویب سائٹوں پر آئے دن ایسی چیزیں آتی رہتی ہیں۔ قرآن سے ناواقف غیر مسلم ہی نہیں عام مسلمان بھی معلومات کی کمی کی وجہ سے ان کے سبب شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔[49] " احیائے اسلام اور معلم " کے مصنف خرم جاہ مراد بھی مسلمانوں کی کمزوریوں اور موجودہ پریشانیوں کا سبب اہل مغرب کا مسلمانوں کے خلاف پراپگنڈہ اور ان کی علمی و عملی کاوشیں ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس بارے میں آگاہ رہنا چاہئے۔ مغربی نظام تعلیم نے مسلمان کی روح کو پھاڑ دیا اور اس کی انفرادی و اجتماعی شخصیت کو بکھیر دیا یا منتشر کر دیا۔ ایک

CC BY

طرف اس کے عقائد تھے، اس کی روایات تھیں، اس کا ماضی تھا، اس کی تاریخ تھی، اس کی وہ محبت تھی جو اس کو اپنے دین سے، اپنی کتاب سے، اپنے رسولؐ سے تھی۔ اس کی وہ جڑیں تھیں جو اسلام میں پیوست تھیں، اس کی وہ امنگیں اور مقاصد تھے جن کا محور و مرکز اسلام تھا اور دوسری طرف مغربی تہذیب نے اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ اس کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ اپنی صناعی سے جھوٹے نگوں کو ہیرا بناد کھایا۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان پریشان اور حیران ہو کر رہ گیا کہ وہ کس راستے پر جائے اور کس راستے پر نہ جائے۔ 50

7۔ مستقبل کا لائحہ عمل:

مستقبل میں اپنی اسلامی شناخت کو اجاگر کرنے کیلئے مسلمانوں کو نفاق کی بجائے اتفاق سے کام لینا ہو گا۔ ذاتی مفادات کی بجائے اجتماعی طور پر امت مسلمہ کے مفادات کو مد نظر رکھنا ہو گا اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اپنے تھنک ٹینک مل بیٹھ کر سائنسی اور معاشری تعاون کے بڑے بڑے ادارے تشکیل دے سکتے ہیں تا کہ مسلمان ممالک غیر مسلم ممالک کی بجائے آپس میں تعاون کو فروغ دے کر سائنسی و معاشی سرگرمیوں کو پروان چڑھا سکیں۔ مسلمانوں کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ دوسری غیر اسلامی ازموں، عقیدوں سے جان چھڑائیں، یہ ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اسلام پر قائم رہیں۔ کیمونزم، سرمایہ داری وغیرہ کے بلاکوں سے علیحدہ رہیں، ایک اسلامی بلاک قائم رکھیں۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے ممالک کو اس چیز نے بڑا نقصان دیا کہ کوئی روسی بلاک میں ہے کوئی کسی اور بلاک میں انہی بلاکوں کے مفادات کی خاطر انہوں نے دوسرے مسلمان ممالک کو نقصان پہنچایا، خود مسلمان کے گلے کاٹے۔ [51] ڈاکٹر مبارک علی بھی اپنی تصنیف "علماء اور سیاست" میں اختلافات کو مٹانے اور مسلمان ملکوں کا معاشری و سائنسی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور دفاع کے لئے متحدہ بلاک کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان ملک میں معاشرہ جب کبھی کسی بحران سے دو چار ہوتا ہے یا اندرونی و بیرونی خطرات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ تمام مسلمان ممالک متحد ہو جائیں اور مسلمان اقوام تمام اختلافات کو مٹا کر ایک امہ بن جائیں۔ اس سلسلہ میں ہمیشہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ماضی میں مسلمان ایک قوم تھی اور جب تک متحد رہے دنیا پر حکومت کی، مگر جیسے ہی ان میں اختلافات ابھرے، امہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اسی کے ساتھ اس کا زوال بھی ہو گیا۔ اس لئے اگر ماضی کی طرح آج بھی یہ سب مل جائیں اور نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر ایک ہو جائیں تو دنیا میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ [52]

بلاشبہ مسلمانوں کے لئے مستقبل بھی اہم ہے اور ماضی بھی ناقابل فراموش، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کو مستقبل کے تقاضے پورا کرنے کے لئے اور مستقبل میں دوسروں کے راہبر بننے کے لئے جدید دور سے آراستہ کرنے کے لئے جدید تعلیم سے مزین معاشرہ تیار کرنا ہو گا جو کہ جدید تعلیم سے لیس بھی ہوں اور اسلامی شعار پر عمل پیرا ہونے میں سخت ہوں اور اجتہادی انداز سے بھی آگاہ ہوں۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال میں ہمارے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہم قدامت پرستی کو برقرار رکھتے ہوئے اتھارٹی اور فرسودہ روایات کے تسلسل کو جاری رکھیں یا تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ خود کو اور اپنی سوسائٹی کو بھی تبدیل کریں کیوں کہ قدامت پرستی کا تعلق ماضی سے ہے، جب کہ تبدیلی کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں ماضی

CC BY

چاہئے یا مستقبل؟[53] بلاشبہ موجودہ دور میں دنیا کے جدت خیالی کے نظریات کی روشنی میں دینی مدارس کے طلباء اور دینی مدارس کو بنیاد پرست اور پسماندہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جدید دور میں دین اسلام کو امت کو ثابت قدم رکھنے میں دینی مدارس کا ہی کردار قابل تحسین ہے۔ آج ملت اسلامیہ کا کارواں جن تند و تیز طوفان سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ ہر ذی شعور راہی کو ضرور ہے۔ ایک طرف نام نہاد روشن خیالی کا دیمک جو اقدار کو چاٹنے کی درپہ ہیں اور دوسری طرف افغانستان سے لے کر لبنان تک، گروزنی سے لے کر غزہ تک اور کشمیر سے لے کر فلوجہ رماوی تک مسلم امہ کا خون بہہ رہا ہے۔ ایسے میں مدارس دینیہ وہ مورچہ ہیں جن سے مسلم امہ کے وجود اور شعور کے ساتھ ساتھ فروغ علم اور عشق رسول ؐ کی حفاظت کا مورچہ بن سکتے ہیں۔[54] پس جدید دور کے مسائل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے اور اپنی طاقت کو یکجا کرنے کے لئے بحث برائے بحث اور تنقید برائے تنقید سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی اور حکومتی سطح پر بھی غیر ملکی ثقافتی یلغار کو روکنے کے لئے اقدام کرنا ہوں گے اور غیر ملکی اسلامی کلچر کی حوصلہ شکنی کے لئے اساتذہ کو خود ہی اسلامی شعائر کا پابند بنانا ہوگا اور اپنی تدریس میں بھی طلباء کی راہنمائی کرنا ہوگی تاکہ اسلامی شعائر پر عمل کرنے میں وہ فخر محسوس کریں۔ اس وقت مسلمان جن خطرات میں گھرے، جن مسائل میں الجھے، جن چیلنجوں سے نبرد آزما اور تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گذر رہے ہیں وہ ہر گز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی طاقت و توانائی ان فروعی مسائل میں صرف کریں جو بحث و تحقیق کے مراحل سے گزر چکے ہیں اور صدیوں سے ان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے یا کسی فقہی مسلک کی کسی ایسے مسئلہ کی وجہ سے مخالفت کریں جو کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے امت کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، اسلئے ضروری ہے کہ اپنی توانائی صرف تعمیری کاموں میں صرف کی جائے اور اپنی کوششوں کو بطور اخلاقی بگاڑ، مشرکانہ عقائد، جاہلی رسوم و رواج اور غیر اسلامی بود و باش کی اصلاح کو بنایا جائے۔[55] بلاشبہ عدم برداشت کا رجحان نہ صرف انفرادی زندگی میں مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے بلکہ اجتماعی معاشرتی زندگی میں اس کے منفی اثرات کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں لیکن عدم برداشت کی وجوہات میں بے چینی، ناامیدی، گھریلو غیر مناسب حالات اور تعلقات بھی شامل ہیں۔ لہذا صبر و تحمل، رواداری، گھریلو افراد کے مناسب رویوں سے برداشت کا رجحان پیدا کیا جاسکتا ہے جو اجتماعی زندگی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ لیکن جدید دور میں معاشری بہتری اور معاشری مسائل کے حل کے بغیر بھی خوشگوار معاشرتی فضا پیدا کرنا مشکل ہو جائے گی۔ لہذا ملکی سطح پر نوجوانوں کے مسائل حل کرنے اور معاشی زندگیاں بہتر بنانے سے ترقی پذیر ممالک کے افراد کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو ایک خوش کن اور رواداری والے معاشرہ میں بدلا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے گھریلو سطح پر اور حکومتی سطح پر معاشری مسائل حل کرنے کی پالیسیاں ناگزیر ہیں ۔ تاکہ لوگوں کی پریشانیوں کو حل کیا جاسکے کیوں کہ پریشان، مایوس اور معاشی طور پر پسماندہ کے لئے صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

CC BY

سفارشات:

1. اسلامی تہذیب کا فروغ، علمائے کرام، اساتذہ، میڈیا اُمت مسلمہ کے حکمرانوں کا کردار۔
2. OIC کا کردار۔
3. اسلامی تعلیمات کا فروغ۔
4. تعلیمی اداروں میں سیرت کی تعلیمی وترویج
5. فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی
6. بھائی چارہ کا فروغ

[1] آئی۔ اے۔ رحمن، مذہبی رواداری: محرکات اور تاریخی پس منظر، مرتبہ تنویر جہاں (فروری 2008ء) ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ، لاہور، ص 33

[2] علی عزت بیگووچ، ترجمہ: پروفیسر محمد ایوب منیر (اپریل 1995ء) مغرب میں خاندان کا زوال خیالی ریاست اور خاندان، ماہنامہ افکار معلم، لاہور، جلد 7، شمارہ 4، ص 28

[3] خٹک معین الدین مولانا (دسمبر 2001ء) اسلام اور عصر حاضر کا چیلنج، مرتب، پروفیسر نور ور جان، ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور، ص 150 تا 151

[4] ندویؒ ابوالحسن علی سید مولانا، (اگست 2012ء) مدارس اسلامیہ، اہمیت، ضرورت اور مقاصد، مرتب: عبدالہادی اعظمی ندویؒ، مجلس نشر واشاعت اسلام، کراچی، ص 100

[5] ہاشمی عبدالقدوس مولانا (2002ء) مقالات ہاشمی، چند علمی و تحقیقی مکاتیب کا مجموعہ، دارالتذکیر، لاہور، ص 6

[6] محمد تقی عثمانی (دسمبر 2005ء) ہمارا تعلیمی نظام، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ص 83

[7] قریشی وحید ڈاکٹر (1998ء) تعلیم کے بنیادی مباحث، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص 21

[8] فضل الرحمن ڈاکٹر (دسمبر 1965ء) اسلام، ترجمہ محمد کاظم، مشعل بکس، لاہور، ص 224

[9] غازی انور (جنوری 2011ء) دہشت گردی کے اڈے یا خیر کے مراکز، الحجاز پبلشرز، کراچی، ص 61

[10] اسرار احمد ڈاکٹر (نومبر 2013ء) موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ص 56

[11] سنبھلی عتیق الرحمن مولانا، ابو عمار زاہد الراشدی (فروری 2008ء) مذہبی جماعتیں اور انتخابی سیاست، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، ص 67

[12] عزیز احمد پروفیسر (جون 1997ء) برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص 374

[13] غازی انور (جنوری 2011ء) دہشت گردی کے اڈے یا خیر کے مراکز، الحجاز پبلشرز، کراچی، ص 69

[14] سمیع الحق مولانا (اگست 1976ء) اسلام اور عصر حاضر، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، ص 231 تا 232

[15] مودودیؒ ابوالاعلیٰ سید (ستمبر 2008ء) اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ص 688 تا 689

[16] ندویؒ اعظمی عبدالہادی مولانا (اکتوبر 2014ء) نظام تعلیم، دارالاشاعت، کراچی، ص 98

[17] اسرار احمد ڈاکٹر (مارچ 2006ء) استحکام پاکستان، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ص 175

[18] عبدالرشید ارشد ڈاکٹر (جون 1999ء) دینی تعلیم اور اصلاح معاشرہ، اشاعت الحکمت، لاہور، ص 45

[19] مودودیؒ ابوالاعلیٰ سید (س ن) نظام تعلیم، مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت، مرتب عبدالہادی اعظمی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص 76

[20] فضل الرحمن ڈاکٹر (1998ء) اسلام اور جدیدیت، ترجمہ، محمد کاظم، مکتبہ جدید، لاہور، ص 146

CC BY

[21] عیسانی عثمان علی کیپٹن ڈاکٹر، ورک محمد لطیف ڈاکٹر (2005ء) پاکستان میں اعلیٰ تعلیم، ماضی، حال اور مستقبل، مترجم: عبدالحمید اعظمی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ص540

[22] زاہد الراشدی ابو عمار (جولائی 2008ء) خطبات راشدی (جلد اول) مرتب قاری جمیل الرحمن اختر، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ص148

[23] مقصود احمد (اپریل 1995ء) ارکان تنظیم کو فعال کیسے بنایا جائے؟ ماہنامہ افکار معلم، لاہور، جلد 7 شمارہ 4، ص42 تا 43

[24] ترکشا کر غلام مرتضیٰ (1995ء) پاکستانی معاشرہ، علمی کتب خانہ، لاہور، ص196

[25] قبلہ ایاز ڈاکٹر پروفیسر، سیاسی امور و معاملات، انتہا پسندانہ رویے اور منع نبویؐ، مرتب: پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر (2009ء) مقالات سیرت نبویؐ، پہلی سہ روزہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقدہ، 11، 13 فروری 2000ء، سیرت چیئر دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ص195

[26] ایوبی محمد طارق ڈاکٹر مولانا (2015ء) مفکر اسلام (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک مطالعہ) مجلس نشریات اسلام کراچی، ص136

[27] نعیم الدین محمد حافظ (2007ء) فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد بھیرہ شریف، ص206

[28] مودودیؒ ابوالاعلیٰ سید (اگست 2002ء) تعلیمات، اسلامک پبلیکشنز، لاہور، ص181

[29] مودودیؒ ابوالاعلیٰ سید (طبع دہم، نومبر 2009ء) تصریحات، مرتب سلیم منصور خالد، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ص189

[30] ندویؒ ابوالحسن علی سید (جولائی 1992ء) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشر و اشاعت اسلام، کراچی، ص189

[31] نعیم الدین محمد حافظ (2007ء) فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد بھیرہ شریف، ص140

[32] عزیز احمد پروفیسر (جون 1997ء) برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص362

[33] جنک معین الدین مولانا (دسمبر 2001ء) اسلام اور عصر حاضر کا چیلنج، تدوین و ترتیب (پروفیسر نور ورجان) ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور، ص283

[34] وجاہت مسعود (بنیاد پرستی کیا ہے؟) مرتبہ تنویر جہاں (فروری 2008ء) رواداری (منتخب تحریریں اور دستاویزات) ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ، لاہور، ص14

[35] اصمعی ثروت جمال (دوسرا ایڈیشن، جولائی 2010ء) دہشت گردی اور مسلمان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص180

[36] محمد سلیم سید پروفیسر (اشاعت پنجم، دسمبر 2002ء) مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ص127

[37] محمد حسین ملک پروفیسر (جون 2015ء) چینل دہشت گردی اور علماء کرام، ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد 19 شمارہ 6 ص2

[38] اسرار احمد ڈاکٹر (مارچ 2006ء) استحکام پاکستان، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ص175

[39] خالد رحمن (2008ء) دینی مدارس ــــــ تبدیلی کے رجحانات، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص32

[40] زاہد الراشدی ابو عمار (فروری 2008ء) مذہبی جماعتیں اور انتخابی سیاست الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ص12 تا 13

[41] غازی انور (جنوری 2011ء) دہشت گردی کے اڈے یا خیر کے مراکز، الحجاز پبلشرز، کراچی، ص61

[42] مراد خرم جاہ (جون 1999ء) احیائے اسلام اور معلم۔ ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ص30

[43] محمد تقی عثمانی (جولائی 2009ء) اسلام اور جدت پسندی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ص45

[44] محمد تقی عثمانی (دسمبر 2005ء) اصلاح معاشرہ، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ص72

[45] محمد ارشد (اکتوبر 2011ء) اسلامی ریاست کی تشکیل جدید، معروف نو مسلم سکالر محمد اسد کے افکار کا تنقیدی مطالعہ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ص483

[46] فاروقی نثار احمد ڈاکٹر پروفیسر، روایتی مدارس کی اصلاح کی ضرورت کیوں؟ مولانا ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری (جولائی 2002ء) دینی مدارس نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، فضلی سنز، کراچی، ص261

[47] سمیع الحق مولانا (اگست 1976ء) اسلام اور عصر حاضر، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، ص27

[48] محمد تقی عثمانی (دسمبر 2005ء) ہمارا تعلیمی نظام، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ص101

[49] اصمعی ثروت جمال (دوسرا ایڈیشن، جولائی 2010ء) دہشت گردی اور مسلمان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص182

[50] مراد خرم جاہ (جون 1999ء) احیائے اسلام اور معلم۔ ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ص30

[51] عبدالغفور حافظ ڈاکٹر پروفیسر (اکیسویں صدی کے مسائل اور ان کا حل سیرت نبویؐ کی روشنی میں) مرتب: پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر (2009ء) مقالات سیرت نبویؐ (پہلی سہ روزہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقدہ، 11، 13 فروری 2000ء) سیرت چیئر دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ص647

[52] مبارک علی ڈاکٹر (2015ء) علماء اور سیاست، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ص155

CC BY

[53] مبارکعلی ڈاکٹر (2012ء) تاریخ کی آگہی، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ص139

[54] محمد نعیم الدین حافظ (2007ء) فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد، بھیرہ شریف، ص286

[55] ندویؒ ابوالحسن علی سید (اپریل 1996ء) بصائر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص55

CC BY